صبا اکبرآبادی

ہم کلام

فارسی رباعیاتِ غالب کا ترجمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم
کلام

ہم کلام

فارسی رباعیاتِ غالب کا ترجمہ

صبا اکبر آبادی

بختیار اکیڈمی

اہتمام ــــــــــــ سلطان جمیل نسیم

منتظم ــــــــــــ ملاحت کلیم شیروانی

مشاورت
شجیع عالم
شیخ فرخ سلیم
جاوید رضا نقوی
تاجدار عادل

تزئین ــــــــــــ فریسہ ارم عالم

بارِ اوّل ــــــــــــ فروری ۱۹۸۶ء

تعداد ــــــــــــ گیارہ سو

مطبع ــــــــــــ سعد پبلی کیشنز۔ ناظم آباد

قیمت : ۶۰ روپے

ناشر: بختیار اکیڈمی

۳/۴۹ اے۔ گلشنِ اقبال ــــ کراچی

انتساب

طارق نواز جعفر

اور

نسلِ نو کے مستقبل کے نام

ترتیب

پیش لفظ

دیباچہ

۱	غالب آزادہَ موحد کیشم	غالب آزاد ہوں موحد ہوں میں	۱۷
۲	غالب بہ گہر ز دودہٓ زادشم	غالب ہے نسب نامہ مرا تیغ دو دم	۱۸
۳	راہیست ز عبد تا حضوراللہ	اک راستہ بندے کا ہے تا ذاتِ الٰہ	۱۹
۴	شرط است بہ ہر در مظفر گشتن	لازم ہے حیات میں مُظفر ہونا	۲۰
۵	ہرچند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ	حالانکہ خراب و ناسزا ہیں ہم سب	۲۱
۶	آن راکہ عطیہ ازل در نظر است	ہر اک کے لیے عطائے رحمت ہے الگ	۲۲
۷	آں خستہ کہ در نظر بجز یادش نیست	جز دوست یہاں پیشِ نظر کوئی نہیں	۲۳
۸	گیرم کہ ز دہر رسم غم بر خیزد	ممکن ہے جہاں سے رسمِ غم اٹھ جائے	۲۴
۹	جانیست مرا ز غم شمارے در وے	ہے زیست غموں کی ایک دُنیا جس میں	۲۵
۱۰	بر دل از دیدہ فتح بابست ایں خواب	عظمت کے لیے باب کشا ہے یہ خواب	۲۶
۱۱	بینائیِ چشم مہر و ماہست ایں خواب	چشم مہ و مہر کی یہ بینائی ہے	۲۷
۱۲	ایں خواب کہ روشناس روزش گویند	آئینہ نمائے روزِ کیتی یہ خواب	۲۸
۱۳	خوابے کہ فروغ دین از و جلوہ گراست	جس خواب میں ہو فروغِ دیں جلوہ گر	۲۹
۱۴	شاہا، ہرچند دایہ جوے آمدہ ام	معلوم ہے اے شاہ کہ کیوں آیا ہوں	۳۰
۱۵	ایضاً	آئے ہیں لیے ہوئے تمنائیں کیا	۳۱
۱۶	در سینہ ز غم زخمِ نہانی دارم	سینے میں غم و زخم نہاں رکھتا ہوں	۳۲
۱۷	زانجا کہ دلم بوہم در بند بنود	اُس شہر میں دل ہے کا در بند نہ تھا	۳۳

۱۸	ایں رسم کہ بخشندۂ شاہی ہر سال	یہ رسم کہ انعامِ شہنشہ ہر سال	۳۴
۱۹	اے آں کہ براہ کعبہ روئے داری	اے شخص جو کعبہ کی طرف جاتا ہے	۳۵
۲۰	خواہم کہ دگر سخن بہ پیغارہ کنم	خواہش ہے کہ گفتگوئے بے باک کروں	۳۶
۲۱	اے جام شرابِ شاد کامی زدہ ای	تو عیش میں شاد کام رہنے والا	۳۷
۲۲	امروز شرارہ بداغم زدہ اند	کس نے مرے داغ پر شرر رکھا ہے	۳۸
۲۳	اے آں کہ تراسعی بدرمانِ من است	اے تو کہ ہے مائل علاجِ دلِ زار	۳۹
۲۴	زیں موئے کہ برمیان تُست اے بدکیش	یہ بند کمر جو تُو نے باندھا بدکیش	۴۰
۲۵	در بزمِ نشاط خستگان راچہ نشاط	کیا بزمِ طرب سے غم نصیبوں کو خوشی	۴۱
۲۶	شاہیم زبانہ افسر داغ اورنگ	ہے داغ مرا تخت جو شعلوں کا ہے تاج	۴۲
۲۷	بادست غمِ آں باد کہ حاصل ببرد	اُٹھے گا جو طوفان ستم کردے گا	۴۳
۲۸	چہ گر کہ زرخمہ زخم بر چنگ زند	مضراب کو تار سے خصومت تو نہیں	۴۴
۲۹	دی دوست بہ بزم بادہ ام خواند نباز	کل یار نے بزم مے میں بُلوایا تھا	۴۵
۳۰	درخوردِ تبر بُود درختے کہ مراست	ہر ایک شجر مرا تبر کے قابل	۴۶
۳۱	یارب سودے بہ روزگاراں مارا	دُنیا میں ہمیں نشاط نو دے یارب	۴۷
۳۲	آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیٔ دہر	پیمانے میں میرے کبھی یہ ساقیٔ دہر	۴۸
۳۳	در باغِ مراد ما زبیداد تگرگ	پڑتے ہیں مرے باغ پہ اولے بیہم	۴۹
۳۴	آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود	شادی جو کرے گا ہوگا دانا کیسے	۵۰
۳۵	یارب بجہانیاں دلِ خرم دہ	اللہ زمانے کو دلِ خرم دے	۵۱
۳۶	روئے تو بہ آفتابِ تابان ماند	چہرہ ترا آفتابِ تاباں کی طرح	۵۲
۳۷	رنجورم و مے بدہر درمان بودم	بیمار ہوں اور مے ہے میرا درماں	۵۳
۳۸	آنے کہ تو شخص مردمے را چشمے	اے تو کہ ہر ایک کو دکھائے آنکھیں	۵۴
		ایضاً	
۳۹		تُو بزم میں ہنس ہنس کے اُٹھائے آنکھیں	۵۵
۴۰	سائل زگدا بجز ندامت نبرد	سائل جو گدا سے مانگے نادِم ہوگا	۵۶
۴۱	ایں نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد	خط آیا، مرے درد کا درماں لایا	۵۷
۴۲	خوش تر بُود آب سوہن از قند و نبات	سوہن کے پانی تیری کیا بات	۵۸
۴۳	ہر چشمہ بہ بحر ہم عنان است اینجا	ہر چشمہ ہے موجِ بحر سے تیز یہاں	۵۹
۴۴	غالب ہر پردہ نوائے دارد	ہر پردہ یہاں ایک نوا رکھتا ہے	۶۰
۴۵	غالب زچو دام گر بدر جستم من	غالب مرا پھندوں سے نکل کر آنا	۶۱
۴۶	صبح است وہمائے فیض و گیتی دامے	ہے صبح ہوائے فیض، دُنیا اک دام	۶۲

۴۷	غالب روش مردم آزاد جداست	غالب ہے ادائے مردِ آزاد جدا	۶۳
۴۸	منصورِ غمش زنکتہ چینیاں چہ بود	غم ایک بلندی سہی پستوں کے لیے	۶۴
۴۹	اے آنکہ گرفتہ ام بکوئے تو پناہ	سمجھا تھا ترے کوچے کو میں جائے پناہ	۶۵
۵۰	ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است	جس شخص کو ہے اصل حقیقت کی خبر	۶۶
۵۱	در عہدِ تو ومنست در ہفت اقلیم	اس میرے ترے دور میں در ہفت اقلیم	۶۷
۵۲	کشتی از موج سوئے ساحل برد	امواج سے کشتی سوئے ساحل جائے	۶۸
۵۳	در عشق بود عرضِ تمنا مشکل	اظہار تمنا ہے نہایت مشکل	۶۹
۵۴	گر دل بہ شرر زدوده باشم خود را	چنگاری کی طرح میں جلاؤں خود کو	۷۰
۵۵	آن کز اثرِ طمع تشاشش آزند	انسان کو طمع یوں سزا دیتی ہے	۷۱
۵۶	اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش	اسباب تو کم دیئے امیدیں زیادہ	۷۲
۵۷	غالب غمِ روزگار ناکامم کشت	غالب مجھے رفتارِ جہاں نے مارا	۷۳
۵۸	شرط است کہ بہر ضبط آداب رسوم	یہ رسم مروجہ ہے سب کو معلوم	۷۴
۵۹	غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست	غالب تیرا سخن میں ہمسر تو نہیں	۷۵
۶۰	گر دیدن زاہداں بہ جنت گستاخ	زاہد جنت میں کیوں قلانچیں بھریں	۷۶
۶۱	آن را کہ بود درستی در فرجام	اک رنگ پہ رہتا نہیں دورِ ایام	۷۷
۶۲	در عالمِ بے زری کہ تلخ است حیات	افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات	۷۸
۶۳	زیں رنگ کہ در گلشنِ احباب دمید	ہر وقت ہے رنگین یہ باغِ احباب	۷۹
۶۴	چون دردِ تہِ پیالہ باقیست ہنوز	ہاں دردِ تہِ پیالہ باقی ہے ابھی	۸۰
۶۵	غالب غمِ روزگار بارش نہ کشد	غالب کو غمِ حیات ہے بارِ عظیم	۸۱
۶۶	ہرچند زمانہ مجمع جہال است	حالانکہ زمانہ ہے ہجوم جہال	۸۲
۶۷	کس را نبود رخے بدینساں کہ تراست	ایسا نہ کسی کا رخ زیبا ہو گا	۸۳
۶۸	تا میکش و جوہر دو سخن ور دارم	ہیں میکش و جوہر جو سخنور میرے	۸۴
۶۹	دستم بہ کلید مخزنے می بایست	ہاتھوں کو ہے اک کلیدِ مخزن درکار	۸۵
۷۰	ہستم ز مئے امید سرمست و بس است	امید کی مے کا کیف کچھ کم بھی نہیں	۸۶
۷۱	گر گرد ز گنج گہرے برخیزد	کیا غم ہے جو اڑ جائے خزانے سے غبار	۸۷
۷۲	اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد	اے تو کہ ہما تیرے تہ دام ہے	۸۸
۷۳	آن دوست کہ جانِ قالبِ مہر و وفاست	وہ دوست جو ہے جانِ کرم روحِ عطا	۸۹
۷۴	تا کے رمدم شفق تراشد از چشم	فرقت میں کریں شفق تراشی آنکھیں	۹۰
۷۵	اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا	بن تیرے مجھے کچھ بھی نہ بھائے آ جا	۹۱

۷۶	شب چیست سویدائے دلِ اہلِ کمال	شب کیا ہے سویدائے دلِ اہلِ کمال	۹۲
۷۷	شام آمد و سر رفت بہ پابوس خیال	شام آتے ہی سراپائے تصور پہ جُھکا	۹۳
۷۸	ہر چند شبے کہ میہمانش کردم	اِک رات اسے جو گھر میں مہمان کیا	۹۴
۷۹	بر قولِ تو اعتماد نتواں کردن	ہر بات پہ اعتماد کیسے رکھتا	۹۵
۸۰	باید کہ دلت ز غصہ درہم نشود	غصّے سے سکون دل کو برہم نہ کرو	۹۶
۸۱	گر در طلب دوست بُود پائے تو سست غمگین مشو	ہے پائے طلب جو راہِ دوست میں اب سست کیوں ہے غمگین	۹۷
۸۲	اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ	آرائش شعر میں ہے کیوں تو مشغول	۹۸
۸۳	در کلبۂ من اگر غبارے بینی	اُٹھے گا اگر گھر سے مرے کوئی غبار	۹۹
۸۴	دانیم کہ آئین شکایت نہ نکوست	یہ جانتا ہوں میں کہ گلہ ہے بیجا	۱۰۰
۸۵	داری چہ ہراس جانستانی از مرگ	کیا موت سے خوفِ جاں ستانی ہے مجھے	۱۰۱
۸۶	دارم دلِ شاد و دیدۂ بینائے	دِل شاد ہے رکھتا ہوں اچھی بینائی	۱۰۲
۸۷	اے تیرہ زمین کہ بُودۂ بسترِ من	اے خاک ادائیں ہیں تری البیلی	۱۰۳
۸۸	تا چند بہ ہنگامہ سلامت باشی	کب تک ہے جہان میں سلامت رہنا	۱۰۴
۸۹	اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت	تزئینِ سخن میں سحر و شام رہا	۱۰۵
۹۰	عمریست کہ در خم خمارم ساقی	مُدّت سے غمِ خمار میں ہوں ساقی	۱۰۶
۹۱	غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب	ہوں روزِ ازل ہی سے میں برگشتہ نصیب	۱۰۷
۹۲	یک روز بہ ترکِ بادہ گوئی غالب	اِک روز شراب چھوڑنا ہے غالب	۱۰۸
۹۳	آن را کہ ز دستِ بے زری پامال است	مفلس ہوں تو کس لیے ستاتا ہے مجھے	۱۰۹
۹۴	ہر چند تواں بے سر و ساماں بُودن	آسان سہی بے سر و ساماں ہونا	۱۱۰
۹۵	باید کہ جہاں دگر ایجاد شود	مائل بہ کرم عالمِ ایجاد رہے	۱۱۱
۹۶	شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر	لازم ہے کہ زندگی میں غم کوش رہوں	۱۱۲
۹۷	نے کشتۂ زخمِ ناوک و شمشیرم	پیکاں کا ہدف ہوں نہ ہلاکِ شمشیر	۱۱۳
۹۸	وقت است کہ آسماں موجہ نازد	ہے وقت کہ آسمان اگر ناز کرے	۱۱۴
۹۹	یارب نفس شرارہ بیزم بخشند	سانسوں کو مری شرر فشانی مل جائے	۱۱۵
۱۰۰	قانع نیم ار بہشت نیزم بخشند	یا مجھ کو بہشت جاودانی مل جائے	۱۱۶
۱۰۱	اور است اگر ہزار چیزم بخشند	مر کے جو گُلِ مراد میرا کھل جائے	۱۱۷
۱۰۲	تا مرکبِ شہریار زین راہ گزشت	کوچے سے مرے شہ کی سواری گزری	۱۱۸
۱۰۳	خواندیم سخن ہائے محبت بسیار	ہاں کی ہیں محبت کی بہت سی باتیں	۱۱۹
۱۰۴	گر ذوق سخن بدہر آئین بُودے	دُنیا میں اگر ذوق سخن کا ہوتا	۱۲۰

صبا اکبر آبادیؔ

صبا اکبر آبادی مشرقی تہذیب اور فنکاری کی ایک جیتی جاگتی مثال ہیں انہوں نے اپنی فطرت اور کائنات کی فطرت کو اپنے آپ میں اس طرح مدغم کرلیا ہے کہ اس نے مل کر ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے غزل، مرثیہ نظمیں، رباعی ہر صنف میں وہ صف اوّل سے آگے کے شاعر نظر آتے ہیں ان کے ہاں کئی رنگوں میں کرنوں کی طرح پھوٹ کر نکل آنے والا احساسِ جمال ہی ہے فکر کی بوقلمونی بھی اور بیان کی بھرپور طاقت بھی !"

میں نے ان کی تازہ تخلیق رباعیاتِ غالب کے ترجمہ کے طور پر دیکھی، غالب ایک ایسا شاعر ہے جس کی عظمت کے بارے میں دو رائے نہیں ہیں اردو کو اس نے رشکِ فارسی بنادیا

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

لیکن اُن کی فارسی شاعری بھی اتنی بے عیب ہے کہ اگر ہندوستانی شعراء فارسی شعراء اور ہندوستان سے باہر کے بھی فارسی شعراء کے کلام میں ان کا کلام شامل کردیا جائے اور کسی سے بھی منسوب کردیا جائے تو وہ دھوکا کھا جائے گا وہ اہلِ فارسی کو مرعوب کرنا چاہتے تھے اس لیے بھی فارسی شاعری کرتے تھے اور یوں ان کو رباعی ضرور کہنی چاہیئے تھی اس لیئے کہ ایک تو فن کے اعتبار سے بہت مشکل صنف رہا اور میرے نزدیک رباعی کسی شاعر کا ٹیسٹ ہوتی ہے کیونکہ اس کا سنبھالنا بھی آسان نہیں لہٰذا بہت سے شاعروں نے ترانے لکھے، جیسے علامہ اقبال اور بابا طاہر عریاں، لہٰذا یہ غالب کے لیئے جیسے لازمی ہو گیا کہ

وہ اپنی فارسی دانی اور قدرتِ فن دکھانے کے لیئے فارسی میں رباعیات کہیں دوسری طرف ذوق نے جو گرامر کا زبان اور محاورات کا ماہر تھا جہاں چار مصرعے لکھے ہیں وہ دراصل قطعات ہیں نہ جانے اس نے انہیں رباعی کا نام کیوں دے دیا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ذوق رباعی کہہ ہی نہیں سکتا تھا اس لیئے ہم صبا کے اس قدر قائل ہیں کہ صبا صِرف رُباعی ہی نہیں کہہ سکتے وہ قدرتِ فن نزاکتِ احساس اور خیال کی حُسن کاری کی ایک مکمل مثال ہیں

دَر باغِ مراد ما زبیداد تگرگ	پڑتے ہیں مرے باغ پہ اولے پیہم
نے نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ	شاخوں کا کروں رنج کہ پتوں کا اَلم
چوں خانہ خرابست چہ نالیم زسیل	میں خانہ خراب ہوں تو آئے سیلاب
چوں زیست وبالیست چہ ترسیم زمرگ	جب زیست وبال ہو تو کیا موت کا غم

جب پہلے سے ہی پورا گھر خراب و برباد ہو تو سیلاب کی کیا شکایت اور جب زندگی ہی وبال ہو تو موت کا کیا غم اس رُباعی میں صبا صاحب نے تگرگ کا ترجمہ اولے کیا ہے اور یہ کام وہی شاعر کر سکتا ہے جو فارسی کا مکمل علم اور اردو پر پوری قدرت اور بیان کی پوری طاقت رکھتا ہو

اس رباعی کو آپ فارسی رباعی سے الگ کر کے دیکھیں تو یہ محسوس ہوتا جیسے یہ ORIGIONAL رباعی ہے ترجمہ نہیں ہے

جب کسی کی فکر میں آہنگ ہو تو میں اُسے اندرونی آہنگ کہتا ہوں اور جب کسی کو زبان و بیان پر قدرت ہو تو اسے بیرونی RYTHM کہتے ہیں صبا صاحب کی فکر میں بھی آہنگ ہے اور بیان میں بھی اسی لیئے ان ترجموں کی شان یہ ہے کہ یہ اندرونی اور بیرونی آہنگ کے امتزاج کی ایک خوبصورت تصویر ہیں

جب میں نے صبا صاحب کے یہ ترجمے دیکھے تو مجھ پر یہ کھلا کہ یہ ترجمے اتنے اعلیٰ درجے کے ہیں کہ ان سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا فارسی کو ہٹا دیں تو یہ ایک اعلیٰ سطح کی تخلیق ہے ترجمے کو درجۂ کمال کی تخلیق بنا دینا معمولی کام نہیں ہے اس کے لیے صبا صاحب جیسے ہی بڑے فنکار کی ضرورت ہوتی ہے، صبا صاحب کی رباعی اپنے آغاز سے انجام تک یوں چلتی ہے جس طرح ہوا کا جھونکا چلتا ہے کیونکہ رباعی کی بحریں لچک در لچک ہوتی ہے۔

یا ربِ جہانیاں دلِ خرم دہ	اللہ زمانے کو دلِ خرّم دے
در دعویٔ جنت آشتی باہم دہ	جنت کی طلب میں دوستی باہم دے
شدّاد پسر نداشت یا غش از تست	شدّاد کے باغ پر ہے دعویٰ اس کو
آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ	آدم کا مکاں بہر بنی آدم دے

جنت مسکنِ آدم تھی تو اب جنت کا مفہوم سمجھنا بڑا ضروری ہے اس کا مطلب ہے آپس میں سچے دل سے ملنا جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کے دکھ میں شامل ہونا اگر دوسرے کا دکھ نہ بٹا سکو تو بھی کم از کم ایسا محسوس ہو جیسے اس دکھ کو اپنے دل میں محسوس کر رہا ہو آدم کو اس کی حیثیت کے لائق مقام ملنا چاہیئے اس میں ہر آدمی ہر انسان شامل ہے یہاں صبا صاحب کی رباعی میں مکان سے مراد مقام ہے یعنی دعا یہ ہے کہ بنی آدم کی زندگی کو جنت بنا دے آپ اس رباعی کے ترجمہ کے مطالعہ کے بعد یہ نہ کہیں کہ اس طرح صبا صاحب کے کلام کی فصاحت اور بلاغت ظاہر ہوتی ہے فصاحت اور بلاغت صرفی اور نحوی اصطلاحیں ہیں یوں کہنا چاہیئے کہ کوئی بھی بات صبا کے اشعار میں ڈھل کر فصیح اور بلیغ ہونے پر مجبور ہے

آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیٔ دہر	پیمانے میں میرے کبھی یہ ساقیٔ دہر
ریزد ہمہ دَرد و دُرد و تلخابہ زہر	بھر دیتا ہے دَرد و دُرد یا جُرعۂ زہر
بگزر زسعادت و نحوست کہ مرا	میرے لیے سعد و نحس دونوں یکساں
ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بہ قہر	ناہید کا غمزہ ہو کہ مریخ کا قہر

"ایک بیساختہ قدرت ہوتی ہے ایک قدرت کا اظہار ہوتا ہے ایک فطری قوت ہوتی ہے صبا صاحب جس شہر کے ہیں وہاں کے شاعروں میں سے میرؔ، نظیرؔ، غالب اور صبا نے اکبر آباد کی زبان کا سارا رس اپنے لفظوں میں بھر لیا ہے

غالب کی ان رُباعیات کا ترجمہ پڑھیں تو ان رباعیات کی پہلی خوبی یہی نظر آئے گی کہ یہ اس مزاج کو سمجھ کر لکھی گئی ہیں جو خود غالب کا مزاج تھا غالب اور صبا صاحب کے مزاج کی ہم آہنگی کا تجزیہ کیجئے تو ان دونوں کی مشترکہ اقدار میں بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اجتہاد کی قوت الگ ہے اور زبان و بیان پر قدرت الگ ہے اِس لیئے مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر غالب بھی اپنی فارسی رباعیات کا ترجمہ کرتے تو اسی طرح کرتے جس طرح صبا نے کیا ہے۔

۹ فروری ۱۹۸۶ء

مجنوں گورکھپوری

غالب کی فارسی رُباعیات

غالب برصغیر کا زندہ عجوبہ تھا۔ اُسکی اردو شاعری نے اُسے شہرتِ دوام بخشی مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھا اور بار بار پکارتا تھا کہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

مگر امتدادِ زمانہ نے اُسی بیرنگی کو اُس کا مایۂ افتخار بنا دیا۔ اگر انگریزی حکومت کا قیام عمل میں نہ آتا اور درباری زبان فارسی رہتی تو شاید غالب کو اس قسم کی تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی مگر وقت پر کس کا اختیار ہے۔ حکومت کے ساتھ فارسی پر بھی زوال آ گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ آج ایک فیصد فارسی داں بھی بمشکل مل سکتے ہیں۔ جو لوگ "آمد اور رفت" کے آشنا ہیں وہ کلامِ فارسی کی خصوصیات سے نا آشنا ہیں اُس کے رَس سے ناواقف ہیں کیونکہ اُن کی فارسی اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تک محدود ہے جس میں وہ مر گر کے کسی نہ کسی طرح "پاس" ہو جاتے ہیں۔ تحقیق لفظی و معنوی سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں۔ اساتذہ متقدمین و متاخرین کے کلام سے بے بہرہ لطف بیاں سے نا آشنا، فارسی زبان کے پیچ و خم میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اب سے ساٹھ ستر برس پہلے تک جب ابتدائی تعلیم چٹائیوں پر بیٹھ کر مولویوں سے حاصل کی جاتی تھی کچھ نہ کچھ فارسی کے اسرار و غوامض ذہن نشین ہو جاتے تھے مگر جب مکتب اجڑنے لگے اور اسکولوں کا دور شروع ہوا تو فارسی بھی معرضِ زوال میں آ گئی اور اب یہ عالم ہے کہ فارسی کے اساتذہ بھی درسگاہوں میں لغت کی مدد سے فارسی پڑھاتے ہیں۔ پھر طالب علموں میں ذوقِ علم بھی باقی نہیں رہا۔ فارسی پڑھ کے کیا کریں۔ نہ کسی دفتر میں کام آتی ہے نہ ملازمت میں ممد و معاون ہوتی ہے حد یہ کہ کوئی علم دوست اپنے بچوں کے لئے فارسی ٹیوٹر بھی مقرر نہیں کرتا۔ پھر فارسی کیوں پڑھی جائے؟ اُن علاقوں میں جو اب بھارت کا حصہ ہیں خود اردو کو اپنی بقا کے لئے جد و جہد کرنا پڑ رہی ہے وہاں فارسی کا کون نام لے۔

ایک ادارہ دیوبند میں قائم ہے جہاں نصابِ تعلیم کا بڑا حصہ عربی ہے فارسی دوسری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ علومِ مشرقیہ پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ اور کسی کا ماتم تو درکنار خود فارسی کا مولد و گہوارہ ایران بھی اپنی قدیم ادبیات کو ترک کر رہا ہے۔ موجودہ فارسی اب سے پچاس برس پہلے کی فارسی سے مختلف البطن معلوم ہوتی ہے یوں ہی اگر آدھی صدی کے فرق سے ایرانی زبان پر نظر ڈالیں تو رودکی، عنصری، قاآنی، خاقانی، ظہوری، فردوسی، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری، ناصر خسرو، رشید و طواط

کی زبان وہاں اجنبی ہو گئی ہے۔ بس ایک رسم الخط ہے جو سب میں یکساں ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں متعدد فارسی گو شعراء گزرے ہیں۔ اب سے ایک صدی قبل تو کوئی اردو شاعر ایسا نہ تھا جس نے فارسی زبان میں طبع آزمائی نہ کی ہو مگر جو گنتی کے نام شعرائے فارسی گو کے برصغیر میں نمایاں ہیں اُن میں حضرت امیر خسروؒ، محمد طاہر غنی کاشمیری، مولینا غنیمت، مرزا بیدل، مرزا غالب اور علامہ اقبال، سرِ فہرست ہیں۔ جہاں تک حضرت امیر خسروؒ کا تعلق ہے وہ تو ایک ہمہ جہت شخصیت اور نابغۂ روزگار تھے، فارسی گوئی میں اہلِ ایران نے ان کا لوہا مانا ہے اِس کے علاوہ فنِ موسیقی، سپاہ گری، انتظامی اُمور میں صلاحیت کے ساتھ وہ ایک طرح ریختہ کے بانی بھی قرار پائے ہیں۔ مُلا طاہر غنی کاشمیری ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے علائق دنیوی سے بے نیاز یادِ الٰہی اور شعر گوئی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ مولینا غنیمت اپنی مثنوی کی بدولت برصغیر کے فارسی ادب میں ایک بلند مقام پیدا کر گئے، مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی اپنی شعر گوئی اور بلاغت سے بڑا نام پیدا کیا اور اُن کے معنوی فرزند مرزا غالب نے فارسی شاعری کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ نظم و نثر فارسی میں غالب کسی طرح نظیری اور ظہوری کے مقابل کمتر نہیں ٹھہرتے بلکہ اکثر مقامات پر ان بزرگوں سے بازی لے جاتے نظر آتے ہیں۔ مرزا کی دستنبو مہر نیم روز، ماہ نیم ماہ، پنج آہنگ نثر فارسی کی شاندار تصانیف ہیں لیکن زوالِ سلطنتِ مغلیہ کے ساتھ یہ سب پردۂ خفا میں چلی گئیں البتہ اُن کی کلیاتِ فارسی جو ان کی حیات ہی میں مرتب ہو گئی تھی اب خال خال علم دوست حضرات کے پاس مطبوعہ شکل میں نظر آتی ہے۔

۱۹۲۸ء سے میں نے دیوانِ غالب کی تضمین شروع کی اور اس بات کا خاص التزام رکھا کہ کسی شعر کو حذف نہ کیا جائے اور تمام غزلیات اور ہر شعر کی تضمین اس طرح کی جائے کہ شعر کا مضمون بھی واضح ہو جائے اور غالب کے شعر کی شرح بھی ہوتی جائے۔

یہ میری شاعری کے ابتدائی عشرے کا واقعہ تھا لہٰذا ارادے بلند اور اعصاب مضبوط تھے اس لئے اندازہ نہ ہوا کہ کتنے بڑے کام کا آغاز کر بیٹھا ہوں اور پھر ایک خود عائد کردہ پابندی یہ تھی کہ اگر کبھی کسی شعر کا مضمون اظہار کے پیرایہ میں نہیں آ رہا ہے تو اُسے چھوڑ کر اگلے شعر کی تضمین نہیں شروع کی بلکہ جب تک وہ منزل سر نہ ہوئی آگے نہ بڑھا۔ بہت سے مواقع پر یُوں بھی ہوا کہ معاشی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی بنا پر چھ، چھ مہینے تضمین کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ یوں ۱۹۲۸ء میں شروع ہونے والی اس کہانی کا اختتام دس سال کے بعد ۳۹ء میں ہوا۔ مشہور ادیب اور محقق مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے اپنی کتاب "نقد و نظر" اشاعت ۴۲ء میں اس تضمین کے بارے میں اپنی مبسوط رائے ظاہر کی ہے اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ وقت ہوا کی طرح گزرتا گیا اور تضمین شائع کرنے کی خواہش ہزاروں دوسری خواہشوں کی طرح خواب ہو گئیں۔ ۴۵ برس بعد فارسی رباعیاتِ

غالبؔ کا رباعی میں ترجمہ کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اِس راہ گزر سے میں جوانی میں بھی گزرا تھا۔ ماضی کا وہ بھاری پتھر اب بھی میرے سر کا تکیہ ہے۔ خدا نے چاہا تو ایک روز آپ کے آرام کے لئے بھی پیش کردوں گا انشاءاللہ لیکن تاحال اس پتھر کو میں نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے غالبؔ کی راہ میں نشانی کے طور پر ثبت کردوں اور نئی نسل بھی اس شاعر کی فکر میں سے اپنی خوشی کشید کرسکے۔

غالبؔ کے قطعات فارسی، نوحہ جات، ترجیع بند، قصائد اور غزلیات کے ذکر کا یہ موقع نہیں کہ وہ ہر صنف میں ایک کوہ بلند نظر آتے ہیں۔ یہاں مجملاً ان کی فارسی رباعیوں کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ مرزا نے اس صنف میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ ہر رُباعی چُست، مرصع اور زورِ بیان کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی تاریخ کا آئینہ نظر آتی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ان کی مدد سے خود غالبؔ کی سوانح عُمری مرتب کرسکتا ہے اُن کے خاندان کا اندازہ لگا سکتا ہے، سالِ ولادت معلوم کرسکتا ہے، اُن کے احباب اور شاگردوں کے حال سے آگاہی مِل سکتی ہے۔ اپنے ہمعصر شعراء کے بارے میں اُن کے خیالات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے عقائد پر روشنی پڑسکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ رباعیوں کو ایک ترتیبِ خاص سے مرتب کیا جائے۔ یہ کام میں نے اہلِ ذوق کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں ان سے استفادہ کریں۔ یہ عرض کرنا بھی بعید از حقیقت نہیں ہوگا کہ بعض بعض رباعیوں کے ترجمے میں مجھے اپنے عجز کا شدت سے احساس ہوا ہے۔ بہرحال غالبؔ شناسوں کے لئے جو فارسی سے ناواقف ہیں یہ ترجمہ کسی حد تک ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

کلامِ غالبؔ کے محاسن اور بلندیٔ اظہار کے لئے نہ مجھ ہیچمداں کا علم کافی ہے نہ مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں نے رباعیات کا ترجمہ اردو رُباعی میں کرکے بڑا تیر مارا ہے۔ یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ خدا کرے کہ اہلِ نظر کو پسند آئے اور پھر اگر زندگی وفا کرے تو غالبؔ کے قطعات، نوحہ جات، مثنویات وغیرہ کا اُردو ترجمہ کرسکوں۔ آپ بھی دُعا کریں کہ انسان کو علم اور قلم عطا کرنے والا میری اِس آرزو کو پُورا کرنے کی مجھے مُہلت اور توفیق عنایت کرے۔

صباؔ اکبرآبادی

بیکم فروری ۱۹۸۶ء

دن۔اے، ۳/۳۷ ناظم آباد۔ کراچی



غالب آزادۂ موحد کیشم
بر پاکیٔ خویشتن گواہِ خویشم
گفتی بہ سخن برفتگان کس نرسد
از باز پسین نکتہ گزاران پیشم

غالب آزاد ہوں موحد ہوں میں
ہاں پاک دِلی کا اپنی شاہد ہوں میں
کہتے ہیں کہ سب کہہ گئے پچھلے شعرا
اب طرزِ سخن کا اپنی موجد ہوں میں





غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زان رو بہ صفائے دمِ تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاکان قلمم

غالب ہے نسب نامہ مرا تیغِ دو دم
تلوار کی دھار ہے نفس سے مرے کم
اب شاعری ہے سپہ گری کے بدلے
ٹوٹے ہوئے نیزوں کو بتایا ہے قلم





راہیست ز عبد تا حضورِ اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشانہا دارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

اک راستہ بندے کا ہے تا ذاتِ اِلٰہ
تُو اُس کو طویل کر دے چاہے کوتاہ
یہ کوثر و طوبیٰ تو ہیں بس صِرف نشاں
ہو چشمہ و سایہ کوئی جیسے سرِ راہ





شرط است بدہر در مظفرؔ گشتن
اسبابِ دلاوری میسّر گشتن
جامے ز شراب ارغوانی باید
آنرا کہ بُود ہوائے خاور گشتن

لازم ہے حیات میں مُظفرؔ ہونا
اسبابِ دلاوری میسّر ہونا
اِک جامِ شراب ارغواں دے اُسکو
وہ شخص جو چاہے مثلِ خاور ہونا





هر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ
در عہدۂ رحمت خدائیم ہمہ
در جلوہ دہد چنانکہ مائیم ہمہ
شائستۂ نفت و بوریائیم ہمہ

حالانکہ خراب و ناسزا ہیں ہم سب
ہاں طالبِ رحمتِ خُدا ہیں ہم سب
تُو جلوہ نما ہو ہم ہیں جیسے بھی ہیں
شائستۂ خاک و بوریا ہیں ہم سب





آن را کہ عطیّہ ازل در نظر است
ہر چند بلا بیش طرب بیش تر است
فرق است میانِ من وضعاں در کفر
بخشش دگر و مُزدِ عبادت دگر است

ہر اک کے لیے عطائے رحمت ہے الگ
ہر درد و الم میں لطف و راحت ہے الگ
کافر سہی لیکن یہ عقیدہ ہے مرا
بخشش ہے الگ اجرِ عبادت ہے الگ





آں خستہ کہ در نظر بجز یارش نیست
باسُود و زیانِ خویشتن کارش نیست
طالب ز طلب رہینِ آثارش نیست
ہر چند حنا برگ دہد بارش نیست

جز دوست یہاں پیشِ نظر کوئی نہیں
اُلفت میں غمِ نفع و ضرر کوئی نہیں
طالب کی غرض طلب ہے مطلوب سے کیا
ہیں برگ حنا میں تو ثمر کوئی نہیں





گیرم کہ ز دہر رسمِ غم برخیزد
شبہائے گزشتہ چون بہم برخیزد
مشکل کہ دہید دادِ ناکامیٔ ما
ہر چند کہ فرجام ستم برخیزد

ممکن ہے جہاں سے رسمِ غم اُٹھ جائے
گزری ہوئی راتوں کا اَلم اُٹھ جائے
مشکل ہے کہ داد پاؤں ناکامی کی
چاہے دُنیا سے ہر ستم اُٹھ جائے





جا نیست مرا ز غم شمارے دروے
اندیشہ فشاندہ خار زارے دروے
ہر پارۂ دل کہ ریزد از دیدۂ من
پابندِ نفس ریزہ چو خارے دروے

ہے زیست غموں کی ایک دُنیا جس میں
تخیّل ہے پھیلا ہوا صحرا، جس میں
آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو دِل کا ٹکڑا
اک پھول ہے ایسا کہ ہو کانٹا جس میں





بر دِل از دیدہ فتح بابست ایں خواب
بارانِ امید را سحاب است ایں خواب
زنہار گمان مبر کہ خواب است این خواب
تعبیر ولائے بوتراب است ایں خواب

عظمت کے لیے باب کشا ہے یہ خواب
اُمّید کی برکھا کی گھٹا ہے یہ خواب
ہرگز نہ خیال کر کہ یہ خواب ہے بس
تعبیر ولائے مرتضیٰ ہے یہ خواب



بینائی چشم مہر و ماہست ایں خواب
پیرایۂ پیکر نگاہست ایں خواب
بر صحتِ ذاتِ شہ گواہست ایں خواب
بیداری بخت پادشاہست ایں خواب

چشم مہ و مہر کی یہ بینائی ہے
اِک شکل نگاہِ شوق میں آئی ہے
صَد شکر کہ بادشہ نے صحت پائی
یہ خواب نشاطِ نو کی انگڑائی ہے





این خواب کہ روشناس روزش گویند
چوں صبح مراد دلِ فروزش گویند
زاں رو کہ بروز دیدہ خسرو چہ عجب
گر خسروِ ملک نیم روزش گویند

آئینہ نمائے روز کہیے یہ خواب
اِک جلوہ دلِ فروز کہیے یہ خواب
دِل میں اسے بادشاہ نے دیکھا ہے
ہاں خسروِ ملکِ نیمروز کہیے یہ خواب



خوابے کہ فروغ دین ازو جلوہ گر است
در روز نصیب شاہِ روشن گہر است
پیداست کہ دیدنِ چنین خواب بروز
تعجیل نتیجۂ دعائے سحر است

جس خواب میں ہو فروغِ دیں جلوہ گر
ہے بہر نصیب شاہِ روشن گوہر
اس خواب کو دن میں دیکھنے کی تعبیر
ہے جلد دُعائے صبح گاہی کا اثر



شاہا، ہرچند دایہ جوے آمدہ ام
دانی کہ چہ مایہ نغز گوئے آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بروئے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجوئے آمدہ ام

معلوم ہے اے شاہ کہ کیوں آیا ہوں
میں شاعرِ بے مثل ہوں یوں آیا ہوں
ہے رنگِ بہار میرے لفظوں سے عیاں
اِس بحر پہ لے کے دِل کا خوں آیا ہوں





شاہا، ہرچند دایہ جوے آمدہ ام
دانی کہ چہ مایہ نغز گوئے آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بروئے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجوئے آمدہ ام

ایضاً

آتے ہیں لیے ہوئے تمنائیں کیا
معلوم نہیں ان میں سے بر آئیں کیا
ساحل پہ کھڑے ہیں ظرفِ خالی لے کر
اب دیکھیے اِس بحر سے لے جائیں کیا





در سینہ زغم زخمِ نہانی دارم
چشم و دل خونابہ فشانی دارم
دانی کہ مرا چون تو نمی باید، ہیچ
اے فارغ ازاں کہ جسم و جانی دارم

سینے میں غم و زخم نہاں رکھتا ہوں
میں دیدۂ و دل کو خوں فشاں رکھتا ہوں
یہ مُشتِ غبار کیسے تجھ سا ہو جائے
تو جانتا ہے میں جسم و جاں رکھتا ہوں





زانجا کہ دِلم بوہم دربند بنود
یا ہیچ علاقہ سخت پیوند بنود
مقصودِ من از کعبہ و آہنگ سفر
جُز ترکِ دیار و زن و فرزند بنود

اُس شہر میں ولہے کا دربند نہ تھا
مضبوط کوئی رشتہ و پیوند نہ تھا
کعبے کا سفر کرنے سے مقصد میرا
جُز ترکِ دیار و زن و فرزند نہ تھا





این رسم کہ بخشندۂ شاہی ہر سال
آید بہ کفم ز خواجہ تاشاں بہ سوال
ما ناست بداں کہ ہر چہ افشاند ابر
از شاخ رسد بہ سبزۂ پائے نہال

یہ رسم کہ انعامِ شہنشہ ہر سال
اُس کے لیے کرتا ہوں محاسب سے سوال
یہ تو ہے وہی بات کہ آبِ باراں
پیڑوں پہ گرے پھر کہیں سبزہ ہو نہال





اے آن کہ براہِ کعبہ روئے داری
نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زین گونہ کہ تُندمی خرامی دانم
درخانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

اے شخص جو کعبہ کی طرف جاتا ہے
خوش ہوں کہ بڑا فرض بجا لاتا ہے
اِس تیز رَوی سے تیری سمجھا ہوں کہ تُو
بیوی سے اَماں گھر میں نہیں پاتا ہے





خواہم کہ دگر سخن بہ پیغارہ کنم
تا جانِ ستم رسیدہ را چارہ کنم
رسم است جواب نامہ چوں نیست جواب
باید کہ تو پس دہی و من پارہ کنم

خواہش ہے کہ گفتگوئے بے باک کروں
اس طرح علاجِ دلِ غمناک کروں
لازم تھا جواب خط کا آنا ورنہ
خط پھیر دے میرا کہ اُسے چاک کروں





اے جام شرابِ شادکامی زدہ ای
در جور دَم از بلند نامی زدہ ای
یاد کہ زین پچو بینی اندر راہے
تنہا روِ خستہ خرامی زدہ ای

تو عیش میں شادکام رہنے والا
تڑپا کے بھی نیک نام رہنے والا
کر یاد مجھے جو راستے میں دیکھے
تنہا، خستہ و سُست گام رہنے والا





امروز شرارهٔ بداغم زده اند
نشتر به رگِ صبر و فراغم زده اند
از کثرتِ شورِ عطسه مغزم ریش است
تا عطرِ چه فتنه بر دماغم زده اند

کس نے مرے داغ پر شرر رکھا ہے
محرومِ فراغ و صبر کر رکھا ہے
چھینکوں سے دماغ ہو رہا ہے ٹکڑے
عطرِ فتنہ یہ کس نے بھر رکھا ہے





اے آن کہ ترا سعی بدرمانِ من است
منعم مکن از بادہ کہ نقصانِ من است
حیف است کہ بعدِ من بہ میراث رود
ایں یک دو سہ خُم کہ در شبستانِ من است

اے تو کہ ہے مائلِ علاجِ دلِ زار
ہے ترکِ شراب کی نصیحت بیکار
افسوس کہ مر جاؤں تو بچ کر رہ جائیں
ورثے میں خُمِ شرابِ صافی دو چار





این موئے کہ بر میان تست اے بدکیش
باشد کمرت خجل ز بے برگی خویش
آمیزش موے بامیانے کہ ترا ست
ہمسائیگی تونگرست و درویش

یہ بند کمر جو تو نے باندھا بد کیش
لازم ہے کہ شرمندہ ہوں دونوں کم و بیش
اس بند کمر کی وہ مثل ہے جیسے
ہو کوئی تونگر کا پڑوسی درویش





در بزمِ نشاط خستگان راچہ نشاط
از عربدہ پائے بستگان راچہ نشاط
گر ابرِ شرابِ ناب بارد غالبؔ
ما جام و سبو شکستگان راچہ نشاط

کیا بزمِ طرب سے غم نصیبوں کو خوشی
شوخی سے ہو کیا ستم رسیدوں کو خوشی
غالبؔ جو گھٹا شراب بھی برسائے
کیا جام و سبو توڑ کے رندوں کو خوشی





شاہیم زبانہ افسرِ داغ اورنگ
داریم بہ بحر و بر ز وحشت آہنگ
مرجان دو رویم زارّہ پشتِ نہنگ
برکوہ زنیم سکّہ از داغِ پلنگ

ہے داغ مرا تخت جو شعلوں کا ہے تاج
خشکی و تری پر مری وحشت کا ہے راج
موتی مرے حکم سے دو پارہ ہو جائے
چیتے کے بدن پر مرے سکّوں کا رواج





با دستِ غمِ آن باد کہ حاصل ببرد
آبِ رُخِ ہوشمند و عاقل ببرد
بگزاشتہ ام خُمے ز صہبا بہ پسر
کش اندہِ مرگِ پدر از دل ببرد

اُٹھّے گا جو طوفانِ ستم کر دے گا
اسبابِ طرب کو وجہِ غم کر دے گا
میں اِک خُم مے چھوڑ چلا بہرِ پسر
کچھ مرگِ پدر کا رَنج کم کر دے گا





چرگر که ز زخمه زخم بر چنگ زند
پیداست که از بہر چہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی خوشی پنہاں است
گازر نہ ز خشم جامہ بر سنگ زند

مضراب کو تار سے خصومت تو نہیں
اس میں کوئی عنوان مُسرّت تو نہیں
ہر رنج میں ایک خوشی چھپی ہوتی ہے
ملبوس سے دھوبی کو عداوت تو نہیں



دی دوست بہ بزم بادہ ام خواند نباز
وانگہ ورقِ مہر بگرداند نباز
چشمِ من و عارضے کہ افروخت بہ مے
دستِ من و دامنے کہ افشاند نباز

کل یار نے بزمِ مے میں بُلوایا تھا
رُخ اپنی عنایات کا دکھلایا تھا
رُخساروں پہ پھُولی ہوئی تھی مے کی شفق
دامن کو مرے ہاتھ سے جھٹکایا تھا





در خوردِ تبر بُوَد درختے کہ مراست
خائیدۂ آتش است رختے کہ مراست
بے آنکہ تو بدنام شوی می کش دم
ناساز تراز خوئے تو بختے کہ مراست

ہر ایک شجر مرا تبر کے قابل
ملبوس ہے شعلہ و شرر کے قابل
بدنامی سے پہلے تیری مر جاؤں گا
تقدیر نہیں تیری نظر کے قابل





یارب سودے بہ روزگاراں مارا
وجہِ گُل و مُل بہ نوبہاراں مارا
صرفِ نمک و جو چہ قدر خواہد شدُ
گنجینۂ ایں صومعہ داراں مارا

دُنیا میں ہمیں نشاط نو دے یارب
شمعِ گُل و مل کو تیز لَو دے یارب
ہم اہلِ توکّل کی طلب اتنی ہے
تھوڑا سا نمک تھوڑے سے جَو دے یارب





آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقئ دہر
ریزد ہمہ دَرد و دُرد و تلخابہ زہر
بگزر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بہ قہر

پیمانے میں میرے کبھی یہ ساقیٔ دہر
بھر دیتا ہے دَرد و دُرد یا جُرعۂ زہر
میرے لیے سعد و نحس دونوں یکساں
ناہید کا غمزہ ہو کہ مریخ کا قہر





در باغِ مراد ما ز بیداد تگرگ
نے نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ
چوں خانہ خرابست چہ نالیم ز سیل
چوں زیست وبالیست چہ ترسیم ز مرگ

پڑتے ہیں مرے باغ پہ اولے پیہم
شاخوں کا کروں رنج کہ پتّوں کا الم
میں خانہ خراب ہوں تو آئے سیلاب
جب زیست وبال ہو تو کیا موت کا غم



آں مرد کہ زن گرفت دانا بنود
از غصّہ فراغتش ہمانا بنود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درد
نازم بخُدا چرا توانا بنود

شادی جو کرے گا ہو گا دانا کیسے
افکار سے پھر جان بچانا کیسے
گھر ساری خدائی میں ہے گھر والی نہیں
پھر میرا خُدا نہ ہو توانا کیسے



یارب بجہانیاں دلِ خرّم دہ
در دعویٔ جنّت آشتی باہم دہ
شدّاد پسر نداشت یا غش از تست
آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ

اللہ زمانے کو دلِ خُرّم دے
جنت کی طلب میں دوستی باہم دے
شدّاد کے باغ پر ہے دعویٰ اس کو
آدم کا مکاں بہرِ بنی آدم دے





روئے تو بہ آفتابِ تابان ماند
خوئے تو بسیل در بیاباں ماند
زین گونہ کہ تار و مار باشد گوئی
زلفِ تو بما خانہ خراباں ماند

چہرہ ترا آفتابِ تاباں کی طرح
عادت ہے تری سیلِ بیاباں کی طرح
جالے بھی جہاں سانپ بھی زلفوں کی ترے
دل ہے مرا اک خانۂ ویراں کی طرح



رنجورم و مے بدہر درمان بودم
نیروئے دل و روشنئ جاں بودم
گفتم بہ پدر کہ خوب مے نوشی کُن
تا بادہ بمیراث فراوان بودم

بیمار ہوں اور مے ہے میرا درماں
یہ قوّتِ دل ہے روشنی بخش جاں
اے کاش مرے باپ بھی ہوتے مے نوش
ترکے میں بہت شراب مل جاتی یہاں





آنے کہ تُو شخص مردمے را چشمے
سُبحان اللہ چہ مایہ بینا چشمے
البتہ عجب نیست کہ باشد بیمار
زان رُو کہ بدلبری سراپا چشمے

اے تُو کہ ہر ایک کو دکھائے آنکھیں
سبحان اللہ یُوں لڑائے آنکھیں
ڈر ہے کہ نہ ہو جائے کبھی خود بیمار
دِل لینے کو جس وقت اُٹھائے آنکھیں



آنے کہ تُو شخص مردمے را چشمے
سُبحان اللہ چہ مایہ بینا چشمے
البتہ عجب نیست کہ باشد بیمار
زان رُو کہ بدلبری سراپا چشمے

ایضاً

تُو بزم میں ہنس ہنس کے اُٹھائے آنکھیں
دانستہ مریضوں سے لڑائے آنکھیں
پھر اُس کی شفایابی کی اُمّید نہیں
تُو جس سے بصد ناز ملائے آنکھیں





سائل ز گدا بجز ندامت نبرد
مرگ از عاشق بجز خجالت نبرد
از سینۂ من کہ قلزمِ خون دلست
جز تیرِ تو کس جاں بسلامت نبرد

سائل جو گدا سے مانگے، نادِم ہو گا
عاشق ہو گا تو مرنا لازم ہو گا
یہ سینہ مرا قلزمِ خوں ہے جس سے
بس تیر ترا نکل کے سالم ہو گا





این نامہ کہ راحتِ دلِ ریش آورد
سرمایۂ آبروئے درویش آورد
در ہر بُنِ مو دمید جانے یعنی
سامانِ نثارِ خویش با خویش آورد

خط آیا، مِرے درد کا درماں لایا
درویش کے گھر عطائے سلطاں لایا
رگ رگ میں مِری روح کو جولانی ہے
صدقے کا خود اپنے آپ ساماں لایا





خوش تر بود آب سوہن از قند و نبات
باوے چہ سخن ز نیل و جیحون و فرات
ایں پارۂ عالمے کہ ہندش نامند
گوئی ظلمات و سوہن است آب حیات

سوہن کے پانی تیری کیا بات
تجھ سے نادم ہیں نیل و جیحون و فرات
یہ خطۂ ارض ہند کہتے ہیں جسے
ظلمات ہے اور اسمیں ہے تو آب حیات



ہر چشمہ بہ بحر ہم عنان است اینجا
ہر خار بُنے ثمر نشانست اینجا
از حاصلِ مرز و بوم بنگالہ مپرس
نے خامہ و ہمیہ خیز رانست اینجا

ہر چشمہ ہے موجِ بحر سے تیز یہاں
ہر خار کی نوک ہے ثمر خیز یہاں
بنگال کی خاک کا اثر یہ دیکھا
رہوارِ قلم پاتا ہے مہمیز یہاں





غالبؔ ہر پردہ نوائے دارد
ہر گوشہ از دہر فضائے دارد
برچیدہ بوست از دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

ہر پردہ یہاں ایک نوا رکھتا ہے
ہر گوشہ زمانے کی فضا رکھتا ہے
دُھل جاتا ہے جتنا ہو دماغوں پہ غُبار
بنگالہ عجب آب و ہوا رکھتا ہے





غالبؔ زچو دام گہ بدر جستم من
آخر زچہ بُود ایں ہمہ بر گشتن
باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش
لیکن بزبانِ جادۂ راہِ وطن

غالبؔ مِرا پھندوں سے نکل کر آنا
انجام میں ہے پھر وہیں واپس جانا
اب چاہیئے خود پہ نفریں کہوں
اربابِ وطن کو پھر ہے منہ دِکھلانا





صُبح است و ہمائے فیض و گیتی دامے
صبح است و ہوائے شوق و گردوں بامے
برخیز و بہ روزگار ہم رنگ بیار
با بادۂ نابے و بلوریں جامے

ہے صُبح ہوائے فیض ، دُنیا اِک دام
لاتی ہے ہوائے شوق مجُھ کو سرِ بام
اُٹھ اور ذرا رنگِ زمانہ سے مِلا
یہ بادۂ ناب اور یہ نازک جام





غالبؔ روشِ مردمِ آزاد جُدا است
رفتار اسیرانِ رہ و زاد جُدا است
ما ترکِ مراد را ارم می دانم
وان باغچۂ ضبطی شدّاد جُدا است

غالبؔ ہے ادائے مردِ آزاد جُدا
خواہش کے اسیروں کی ہے اُفتاد جُدا
میں ترکِ تمنّا کو سمجھتا ہوں بہشت
ہے گلشنِ متروکۂ شدّاد جُدا





منصورِ غمش ز نکتہ چینیاں چہ بُود
در راست خطر ز ہم نشینیاں چہ بُود
چوں عاقبت یگانہ بینان دار است
دریاب کہ انجامِ دو بینان چہ بُود

غم ایک بُلندی سہی پستوں کے لیے
سچائی میں کیا خطر ہے مستوں کے لیے
توحید نگاہی کا نتیجہ ہے جو دار
انجام ہے کیا دوئی پرستوں کے لیے



اے آنکہ گرفتہ ام بجوئے تو پناہ
رانی چو بہ عنف از درِ خویشم ناگاہ
تا کعبہ روم ز درگہت رو بہ قفا
چوں بگزرم از کعبہ ہم روئے براہ

سمجھا تھا ترے کوچے کو میں جائے پناہ
کیوں دَر سے مجھے اپنے ہٹایا ناگاہ
دَر سے ترے کعبے کو جو واپس جاؤں
کعبے سے جو نکلوں تو ہے پھر کونسی راہ





ہر کس ز حقیقت خبرے داشتہ است
بر خاک رہِ عجز سرے داشتہ است
زاہد ز خدا ارم بہ دعویٰ طلبد
شدّاد ہمانا پسرے داشتہ است

جس شخص کو ہے اصل حقیقت کی خبر
رکھتا ہے زمیں پہ عاجزی سے وہ سَر
زاہد کو خُدا سے یُوں اِرم کی ہے طلب
جس طرح کہ شدّاد کا کوئی ہو پِسر





در عہدِ تو و منست در ہفت اقلیم
برخاستنِ اُمیّد و خون گشتن بیم
از جلوہ چہ ماند تا بسازند بہشت
از شعلہ چہ ماند تا بتابند جحیم

اِس میرے ترے دَور میں در ہفت اقلیم
سب خاک میں مِل گئے ہیں اُمیّد اور بیم
جلووں سے بچا کیا ہے سجائیں جو بہشت
داغوں سے بچا کیا ہے جو بھڑکائیں جحیم





کشتی از موج سوئے ساحل بَرَود
رہرو از جادہ تا بہ منزل بَرَود
خود شکوہ دلیل رفعِ آزار بس است
آید بزبان ہر آنچہ از دل بَرَود

امواج سے کشتی سوئے ساحل جائے
رہرو چل چل کے سوئے منزل جائے
شکوہ ہے دلیلِ رفعِ آزار سمجھ
آئے جو زباں پر تو غمِ دل جائے





دَرعشق بُود عرضِ تمنّا مُشکل
کاینجاست نفس غرقہ بخونابہ دلِ
در بادیہ فتادہ راہم کہ در اوست
پا ہا ز گداز زہرۂ خاک بہ گل

اظہار تمنّا ہے نہایت مشکل
ہر سانس میں خونِ دلِ ہوا ہے شامل
آیا ہوں بھٹک کے ایسے جنگل میں جہاں
زخمی ہوئے پاؤں اور پانی ہوا دلِ





گر دلِ بہ شرر زدودہ باشم خود را
ور بر دمِ تیغ سودہ باشم خود را
حاشا کہ ز تو ربودہ باشم خود را
با خوئے تو آزمودہ باشم خود را

چنگاری کی طرح میں جلاؤں خود کو
تلوار کی دھار پر چلاؤں خود کو
ممکن نہیں دُور لے کے جاؤں خود کو
عادت سے تری نہ آزماؤں خود کو





آن کز اثرِ طمع تشانش آرند
گر خود بہ ہوائے استخوانش آرند
گر پردگی قلمرو بال ہماست
چُوں سایہ بخاک موکشانش آرند

انسان کو طمع یُوں سزا دیتی ہے
محتاج یک استخواں بنا دیتی ہے
پرواز میں ہو اگر ہما کی مانند
سائے کی طرح خاک چٹا دیتی ہے





اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آن روز کہ وقتِ باز پُرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم
باحسرتِ عیش ہائے ناکردۂ خویش

اسباب تو کم دیئے اُمیدیں زیادہ
اب حشر کے میدان میں ہوں افتادہ
اب بخش بھی دے کہ یاد آتی ہے مجھے
تصویرِ خیالِ عیش رہ گئی ہے سادہ



غالب غمِ روزگار ناکامم کُشت
از تنگیٔ دِل بہ حلقۂ دامم کُشت
ہم غیرتِ سربزرگیٔ خاصم سوخت
ہم رشکِ نشاطِ مندیٔ عامم کُشت

غالب مجھے رفتارِ جہاں نے مارا
دِل تنگ ہوں حلقۂ زیاں نے مارا
کچھ عامیوں کے خواص بننے سے جلا
کچھ رشکِ نشاطِ دیگراں نے مارا





شرط است کہ بہر ضبطِ آداب و رسوم
خیزد بعد از نبیؐ امامِ معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرای
مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

یہ رسمِ مروّجہ ہے سب کو معلوم
آتا ہے نبیؐ کے بعد امامِ معصوم
کثرتِ پہ نہ جا علی کے رُتبے کو سمجھ
سورج کی جگہ چاند ہے یا ہونگے نجوم



غالب بہ سخن گرچہ کست ہمسر نیست
از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت و نغز و آنگہ بسیار
ایں بادہ فروش ساقیٔ کوثر نیست

غالب تیرا سخن میں ہمسر تو نہیں
پھر بھی تو حدِ ہوش سے باہر تو نہیں
مے چاہتا ہے مُفت نفیس اور بے حد
یہ پیرِ مغاں ساقیٔ کوثر تو نہیں





گر دیدن زاہداں بہ جنّت گُستاخ
وین دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

زاہد جنت میں کیوں قلانچیں نہ بھریں
اب تک نہ کئے تھے جو مزے کیوں نہ کریں
ان کا ہے وہی حال ز روئے تشبیہ
چوپائے ہرے کھیت کو جسطرح چریں



آن را کہ بُوَد درستیِ در فرجام
ہم محرم خاص آید و ہم مرجع عام
آسان نبود کشاکش یاس و قبول
زنہار نگردی بہ نکوئی بدنام

اِک رنگ پہ رہتا نہیں دورِ ایّام
مردُود بھی ہو جاتے ہیں مقبولِ عوام
ہر اک کو عزیز ہونا آسان نہیں
نیکی کر کے کبھی نہ ہونا بدنام





در عالمِ بے زری کہ تلخ است حیات
طاعت نتواں کرد بہ اُمّیدِ نجات
اے کاش ز حق اشارتِ صوم صلوٰت
بُودے بوجودِ مال چون حج وزکوٰت

افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات
طاعت بھی نہیں ہوتی بہ اُمّید نجات
اے کاش نماز اور روزہ ہوتے
مشروط بہ مال جیسے حج اور زکوٰت





زیں رنگ کہ در گلشنِ احباب دمید
پژمرد گُل و لالۂ شاداب دمید
در کلبۂ اقبال ترقی طلبان
گر مہر فرو نشست مہتاب دمید

ہر وقت ہے رنگین یہ باغِ احباب
مُرجھائے اگر گل تو ہو لالہ شاداب
اقبال پہ ہے جشن ترقی طلبان
سُورج ڈوبے اگر تو نکلے مہتاب





چون دردِ تہِ پیالہ باقیست ہنوز
شادم کہ بہار لالہ باقیست ہنوز
در کیشِ توکّل غمِ فردا کفر است
یک روزہ مے دو سالہ باقیست ہنوز

ہاں دردِ تہِ پیالہ باقی ہے ابھی
خوش ہوں کہ بہارِ لالہ باقی ہے ابھی
ہے کُفر توکّل میں خیالِ فردا
اِک دن کی مے دو سالہ باقی ہے ابھی





غالب غمِ روزگار بارش نہ کشد
وز حورِ بہشت انتظارش نہ کشد
دارد تن و تن ز درد زارش نہ کُند
دارد دل و دل بہیچ کارش نہ کشد

غالب کو غمِ حیات ہے بارِ عظیم
کب تک یہ خیالِ حورِ فردوسِ نعیم
ہے جسم مگر درد کا مارا ہوا جسم
دل سینے میں ہے مگر وہ مجروح و دونیم





ہر چند زمانہ مجمعِ جُہّال است
در جہل نہ حالِ شان بیک منوال است
کودن ہمہ لیک از یکے تا دگرے
فرق خرِ عیسیٰ و خرِ دجال است

حالانکہ زمانہ ہے ہجوم جہُّال
لیکن نہیں سب کے ایک جیسے افعال
بے عقل تو سب ہیں مگر اتنا سا ہے فرق
جیسے خرِ عیسےٰ و حمارِ دجّال





کس را نبود رُخے بدینساں کہ تُراست
پاکیزہ تنے بخوبیٔ جاں کہ تُراست
گفتی کہ زہیچ فتنہ پروا نکنم
آہ از غمِ چشمِ بدخویاں کہ تُراست

ایسا نہ کسی کا رُخِ زیبا ہوگا
دُنیا میں کہاں یہ قدِ بالا ہوگا
تو کہتا ہے کہ تجھ کو کوئی پرواہ نہیں
لگ جائے کوئی نظر تو پھر کیا ہوگا





تا میکش و جوہر دو سخن ور داریم
شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ میکش از ماست
در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

ہیں میکش و جوہر جو سخنور میرے
دیکھے کوئی میری شان تیور میرے
میکش کے سبب پیرِ مغاں ہوں غالب
تلوار ہوں جب کھلتے ہیں جوہر میرے



---

۱ میر احمد حسین المتخلص بہ میکش، ابن میر اکرام حسین فارسی میں شعر کہتے تھے، دہلی میں وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے معرکۂ آزادی میں سزائے دار پائی یا گولی سے مارے گئے۔

۲ منشی جواہر سنگھ خلف رائے چھجمل، پنجاب اور یو پی میں سرکاری ملازم رہے۔ ان کے بھائی منشی ہیرا سنگھ بھی غالب کے عزیز شاگرد تھے۔



دستم بہ کلید مخزنے می بایست
در بُود، ہتی بدا منے می بایست
یا ہیچ گہم بہ کس نیفتادے کار
یا خود بزمانہ چون منے می بایست

ہاتھوں کو ہے اِک کلیدِ مخزن درکار
جب یہ بھی نہ ہو تو پھر ہے دامن درکار
جب کوئی کسی کام نہیں آسکتا
پھر دوست ہے درکار نہ دشمن درکار





ہستم ز مئے امید سرمست و بس است
دارم سرِ ایں کلاوہ در دست و بس است
گر ارزشِ لطف و گرمئ نیست مباش
استحقاقِ ترحمی ہست و بس است

اُمّید کی مے کا کیف کچھ کم بھی نہیں
سر پہ جو نہیں تاج تو سر خم بھی نہیں
حق دارِ کرم ہوں یہ توقع ہے بہت
کب رحم کریں گے مجھے یہ غم بھی نہیں





گر گرد ز گنج گہرے بر خیزد
مپسند کہ دود از جگرے بر خیزد
منّت نتواں نہاد بر گدیہ گراں
بنشیں کہ بخدمت دگرے بر خیزد

کیا غم ہے جو اُڑ جائے خزانے سے غبار
لیکن نہ اُٹھے کسی کے سینے سے شرار
سائل کو عطا کرکے نہ احسان جتا
درویش کی خدمت کو ہیں موجود ہزار





اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد
صاف مئے خسروی بجامت باشد
تسبیح بہر اسم الٰہی کہ بُود
آغاز ز ابتدائے نامت باشد

اے توُ کہ ہما تیرے تہ دام رہے
لبریز مئے شہی ترا جام رہے
اسمائے الٰہی کی جو تسبیح پڑھوں
آغاز میں ہونٹوں پہ ترا نام رہے





آن دوست کہ جانِ قالبِ مہر و وفاست
گر دیر رسد پاسخ مکتوب رواست
زان رشک کہ ریخت دیدہٴ ہنگام رقم
فی الجملہ نورد نامہ دشوار کشاست

وہ دوست جو ہے جانِ کرم روحِ عطا
کیا غم ہے جو خط دیر میں اُس نے لکھّا
وہ اشک جو لکھتے میں گرا کاغذ پر
دشواری حالات کا ہے عُقدہ کُشا





تا کے رمدم شفق تراشد از چشم
ہر دم مژہ خوں بروئے باشد از چشم
قطع نظر از چشم دلے نیزم ہست
بینید کہ خستہ تر بناشد از چشم

فرقت میں کریں شفق تراشی آنکھیں
ہیں سلسلۂ جگر خراشی آنکھیں
قطع نظر آنکھوں کے میں دل رکھتا ہوں
دل پر کریں کاش جلوہ پاشی آنکھیں





اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا
از کوچہ عنبر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخوان کہ من مرگ توام
بر گفتۂ خویش باش و ناخواندہ بیا

بن تیرے مجھے کچھ بھی نہ بھائے آ جا
اب کون ترے سوا ستائے آ جا
تھا حکم ترا کہ میں بلاؤں نہ تجھے
اب اپنے کہے پہ بے بلائے آ جا





شب چیست سویدائے دلِ اہل کمال
سرمایہ دہِ حُسن بزلف و خط و خال
معراج نبی بشب ازاں بوُد کہ نیست
وقتے شائستہ تر ز شب بہرِ وصال

شب کیا ہے سویدائے دِل اہلِ کمال
بڑھ جاتا ہے اور حُسن زلف و خط و خال
معراجِ رسول بھی ہوئی تھی شب میں
اس سے بہتر نہیں تھا کوئی ہنگامِ وصال



شام آمد و سر رفت بہ پابوس خیال
بر تخت شہی نشست کاوس خیال
از گردش گونہ گونہ اشکالِ نجوم
گردید دماغِ دہر فانوس خیال

شام آتے ہی سراپائے تصوّر پہ جُھکا
شاہنشہِ فکر تختِ دل پر بیٹھا
گردش میں بدل رہے ہیں شکلیں تارے
اب کیوں نہ ہو فانوس خیالی دُنیا





ہر چند شبے کہ میہمانش کردم
در خویش برلا بہ مہربانش کردم
آہ از دلِ ہیچگہ میاسائی کہ من
در وصل ز خویش بدگمانش کردم

اِک رات اسے جو گھر میں مہمان کیا
امکان میں جو کچھ تھا وُہ سامان کیا
لیکن دلِ بیتاب کی بے تابی نے
ہنگام وصال اس کو پریشان کیا





بر قولِ تو اعتماد نتواں کردن
خود را بہ گزاف شاد نتواں کردن
از کثرتِ وعدہائے پے در پے تو
یک وعدہٴ درست یاد نتواں کردن

ہر بات پہ اعتماد کیسے رکھتا
الفاظ سے دِل کو شاد کیسے رکھتا
تُو نے کیے مُجھ سے لاکھ جھُوٹے وعدے
سچّا وعدہ میں یاد کیسے رکھتا





باید کہ دلت ز غصّہ درہم نشود
از رفتن زر دستخوش غم نشود
ایں سیم وزرست خواجہ ایں سیم وزرست
غم نیست کہ ہر چند خوری کم نشود

غُصّے سے سکونِ دل کو برہم نہ کرو
دولت نہ رہے اگر تو دِل شاد رکھو
اے منعمو مال وزر ہے یہ غم تو نہیں
کھاتے رہو کم نہ ہو گا، مغموم نہ ہو



گر در طلب دوست بُود پائے تو سُست غمگین مشو
در خود باشی بہ جُستجو تو چابک و چُست مغرور مشو
اخلاص بہ نسبت است و نسبت ازلیست چوں شبنم و مہر
گر جذبہ قوی فتاد و پیوند درست بیخودی رو

ہے پائے طلب جو راہِ دوست میں اب سُست کیوں ہے غمگیں
رہ اپنی حدوں میں ہے اگر چابک و چُست کچھ بات نہیں
اخلاص ہے نسبت سے تو نسبت ازلی جیسے رخ و رو
جذبہ ہے اگر قوی تو رشتہ ہے درست چل جا ہے کہیں





اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیچ
در زلف سخن کشودہ را خم و پیچ
عالم کہ تو چیزے دگرش میدانی
ذاتیست بسیط و منبسط دیگر ہیچ

آرائشِ شعر میں ہے کیوں تو مشغول
اس زلف کے سلجھائے گا کیا تو خم و طول
کیا خود سے سمجھتا ہے زمانے کو الگ
تو اِس کو سمجھ سکے یہ کوشش ہے فضول





در کلبۂ من اگر غبارے بینی
پیچیدہ بخویش، ہمچو مارے بینی
تنگست چنانکہ دائم از صحنِ سرا
از جرم فلک ستارہ وارے بینی

اُٹھے گا اگر گھر سے مِرے کوئی غبار
بل کھاتا ہوا نکلے گا وہ صورتِ مار
ہیں صحن کی تنگی سے فلک جب دیکھوں
شاید کسی تارے کا ہو مجھ کو دیدار





دانیم کہ آئینِ شکایت نہ نکوست
مارا سخن از مرگِ خود و صورت اوست
دانست و نیامد و نپرسید و ندید
ہم خستۂ دشمنیم و ہم کشتۂ دُرست

یہ جانتا ہوں میں کہ گلہ ہے بیجا
ہے مایۂ شعر اُس کا حُسنِ زیبا
دانستہ نہیں آیا، نہ پوچھا، نہ ملا
دشمن نے ستایا دوست نے مار دیا





داری چہ ہراس جانستانی از مرگ
می جوئے حیات جاودانی از مرگ
از سوزِ حرارت عزیزی داغم
تا ساز تراست زندگانی از مرگ

کیا موت سے خوفِ جاں ستانی ہے مجھے
یہ موت حیاتِ جاودانی ہے مجھے
خود سوزِ حیات سے پھنکا جاتا ہوں
خود موت سے تلخ زندگانی ہے مجھے





دارم دلِ شاد و دیدۂ بینائے
وز کرّیِ گوشم بنود پروائے
خوبست کہ نشنوم زہر خود رائے
گلبانگ " انا ربّکم الاعلائے "

دِل شاد ہے رکھتا ہوں ابھی بینائی
بہرے پن میں بھی ہے سکوں افزائی
اچھّا ہے کہ جاہلوں سے سُن سکتا نہیں
یہ شور و شغب ، ترانۂ دانائی



اے تیرہ زمین کہ بُودہ بستر من
ہر خاک کہ باتُست ہمہ بر سر من
زر بہر کسان و بہر من دانہ و دام
اے مادرِ دیگران و مادندرِ من

اے خاک ادائیں ہیں تری البیلی
تُو نے مِٹی کی مجھ سے بازی کھیلی
غیروں کو زر و مال، مجھے رنجِ دوام
تُو سب کی سگی ماں ہے مری سوتیلی





تا چند بہ ہنگامہ سلامت باشی
تا چند ستم کشِ اقامت باشی
گفتی کہ بناشد شبِ غم را سحرے
صد حیف کہ منکرِ قیامت باشی

کب تک ہے جہاں میں سلامت رہنا
کب تک اِس گھر میں ہے حکومت رہنا
کہتے ہو شبِ غم کی سحر نا ممکن
افسوس ہے منکرِ قیامت رہنا





اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت
در فنّ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
بے بُود دوائے ما بہ پیری غالب
زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

تزئینِ سُخن میں سحر و شام رہا
گو اہل کمال میں مرا نام رہا
پیری میں مئے تلخ دوا تھی میری
میں اس کے حصول میں بھی ناکام رہا





عمریست کہ در خمِ خمارم ساقی
تابِ تفِ تشنگی ندارم ساقی
بکشا سرِ مشک و در گلویم سر دہ
سائل بخُمم قدح ندارم ساقی

مدّت سے غمِ خمار میں ہوں ساقی
پیاسا ہوں عذابِ نار میں ہوں ساقی
تو مشکِ شراب کو لگا دے منہ سے
کب جام کے انتظار میں ہوں ساقی





غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب
ہم بیم عدو دارد و ہم بیم حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس
ہم شورشِ شوق آمد و ہم لفظ غریب

۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

ہوں روزِ ازل ہی سے میں برگشتہ نصیب
بے ذکرِ عدو آتی نہیں یادِ حبیب
مخصوص ہے تاریخ ولادت میری
یا شورشِ شوق کہیے یا کہیے غریب

۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ





یک روز بہ ترکِ بادہ گوئی غالب
رُخِ روز دِگر بہ بادہ شوئی غالب
زین توبہ بے بقا چہ جوئی غالب
توبہ لبِ توبہ بست گوئی غالب

اِک روز شراب چھوڑنا ہے غالب
پھر ساقی کے ہاتھ جوڑنا ہے غالب
کیا فائدہ یہ ہوائی توبہ کر کے
رُخ دونوں طرف جو موڑنا ہے غالب





آن را کہ ز دستِ بے زری پامال است
رُسوائی نیز لازمِ احوال است
ما خشک بیم و خرقہ آلودہ بہ مے
ساقی گرش پیالہ از غربال است

مفلس ہوں تو کس لیے ستاتا ہے مجُھے
رُسوائے زمانہ کیوں بناتا ہے مجُھے
لب خُشک ہیں اور جامہ ہے آلودۂ مے
ساقی چھلنی سے کیوں پلاتا ہے مجُھے





ہر چند توان بے سر و سامان بُودن
بازیچۂ خوئے زشتِ طِفلاں بُودن
باللہ کہ بر جگر زدشنہ سخت تراست
از کردنِ خویشتن پشیماں بُودن

آسان سہی بے سر و ساماں ہونا
مشکل ہے جلیسِ زشت خویاں ہونا
واللہ چھُری کے گھاؤ سے کم تو نہیں
اپنے ہی کیے پہ خود پشیماں ہونا





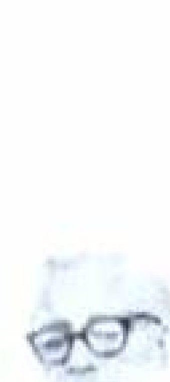
باید کہ جہاں دِگر ایجاد شود
تا کلبۂ ویران آباد شود
در عالمِ انبساط از من خوشتر
مطرب کہ بہ سوزِ دِگران شاد شود

مائل بہ کرم عالمِ ایجاد رہے
شاید مِرا غم خانہ بھی آباد رہے
مجھ سے تو وہی مطرب خوش خو اچھا
جو دوسروں کے گیت پہ دِل شاد رہے



شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ برُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چو کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

لازم ہے کہ زندگی میں غم کوش رہوں
دردِ المِ جاں سے ہم آغوش رہوں
مومن مر جائے پھر میں کافر تو نہیں
کعبے کی طرح کیوں نہ سیہ پوش رہوں





نے کشتۂ زخمِ ناوک و شمشیرم
نے خستۂ ناخن پلنگ و شیرم
لب می گزم و خوں بزباں می لیسم
خوں میخورم و زندگانی سیرم

پیکاں کا ہدف ہوں نہ ہلاکِ شمشیر
چیتے کا میں زخمی ہوں نہ ہوں کشتۂ شیر
حسرت سے لبوں کو چاٹتا رہتا ہوں
خوں پیتا ہوں زندگانی سے ہوں سیر





وقت است کہ آسماں موجّہ نازد
مہر آئینہ پیش رُخ نہد مہ نازد
ایں خود شرف دگر بود نیست عجب
گر مہر بہ پابوس شہنشہ نازد

ہے وقت کہ آسماں اگر ناز کرے
اِترائے جو مہر تو قمر ناز کرے
سورج کیلیے خود یہ شرف کیا کم ہے
ہو شاہ کے پاؤں پہ تو سر ناز کرے





یارب نفس شرارہ بیزم بخشند
یارب مژہائے دجلہ ریزم بخشند
بے سوزِ غمِ عشق مبادا زنہار
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند

سانسوں کو مِری شرر فشانی مِل جائے
اِن آنکھوں کو دریا کی روانی مِل جائے
اُس میں غمِ عاشقی ہو شامل یارب
جب حشر میں مُجھ کو زندگانی مِل جائے



قانع نیم ار بہشت نیزم بخشند
از بخشش خاص تا چہ چیزم بخشند
امّید کہ صرفِ رونمائی تو شود
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند



یا مجھ کو بہشت جاودانی مِل جائے
بخشش بھی زراہِ مہربانی مِل جائے
مطلب مِرا صرف تیرے دیدار سے ہے
جب حشر میں مجھ کو زندگانی مِل جائے



ادراست اگر ہزار چیزم بخشند
ادراست اگر بہشت نیزم بخشند
بر دوست فدا کنم بصد گونہ نشاط
جانے کہ بروز رستخیزم بخشند

مَر کے جو گُلِ مُراد میرا کھِل جائے
کیوں، خلد کی سمت میرا ذوقِ دل جائے
پھر تجھ پہ ہزار بار صدقے کر دوں
جب حشر میں مجھ کو زندگانی مِل جائے





تا مرکبِ شہریار زین راہ گزشت
فرقم بہ فلک رسید و از ماہ گزشت
گر دید رہِ کعبہ رہِ خانۂ من
زین راہ گزین راہ شہنشاہ گزشت

کوچے سے مرے شہ کی سواری گزری
اس دشت سے کیا بادِ بہاری گزری
کعبے کی ہے راہ میرے گھر کا رستہ
اللہ کے گھر میں عمر ساری گزری





خواندیم سُخن ہائے محبّت بسیار
راندیم سُخن ہائے محبّت بسیار
رفتیم ز عالم و در عالم آخر
ماندیم سخن ہائے محبّت بسیار

ہاں کی ہیں محبّت کی بہت سی باتیں
لکھّی ہیں محبّت کی بہت سی باتیں
دُنیا سے میں جاتا ہوں مگر دُنیا میں
چھوڑی ہیں مُحبّت کی بہت سی باتیں





گر ذوقِ سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دین بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

دُنیا میں اگر ذوقِ سخن کا ہوتا
دیواں مرا پروین و ثریّا ہوتا
یہ شاعری دُنیا کا جو مذہب ہوتی
ایمان اُس کا کلام میرا ہوتا



تصانیف صبا اکبرآبادی

چراغِ بہار		غزلیں
سربکف		مرثیے
اوراقِ گل		غزلیں
شہادت		مرثیے
دستِ زرفشاں	(ترجمہ خیام)	رباعیات
ذکر و فکر		سلام منقبت
زمزمۂ پاکستان		ملی نظمیں
خوں ناب		مرثیے
ہم کلام	(غالب کی فارسی رباعیات کا ترجمہ)	رباعیات

زیرِ طبع

دستِ دعا		نعتیہ کلام
ماتم		عزائیہ کلام
سخن ناشنیدہ		غزلیں
سورج جیسے لوگ		خاکے
تضمین		مکمل دیوان غالب کی تضمین
دستِ حق پرست		مرثیے
خانقاہِ میکدہ	(ترجمہ خیام)	رباعیات
خواب میں بہار		غزلیں
یادیں		سوانح حیات